بابو پرشوتم داس ٹنڈن جی نے بھی ایک مؤثر تقریر کے دوران میں قومی کارکنوں کی اسی اخلاقی گراوٹ پر سخت اظہار افسوس کیا "قومی آواز" کا نامہ نگار لکھتا ہے :-

"الہ آباد ۵ ستمبر اسپیکر ٹنڈن نے آج صبح کانگریس کارکنوں کے ایک جلسہ میں جس وقت کانگریس والوں کی بدعنوانی، رشوت ستانی اور اقربا نوازی کا تذکرہ کیا تو وہ گلوگیر ہوگئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، درد سے کانپتی ہوئی آواز میں انھوں نے کہا "کیا ہم اسی لئے لڑے تھے، کیا ہم نے اسی لئے مصیبتیں اٹھائی تھیں اور اپنی جانیں قربان کی تھیں؟ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میرے رفیق اس پستی میں گر جائیں گے تو میں غلامی ہی کو ترجیح دیتا، جب میں ان کانگریسیوں کی بدعنوانیوں کی افسوسناک کہانیاں سنتا ہوں جو آزادی کے لئے لڑے تھے اور جو محب وطن ہونے کا دعوے کرتے ہیں تو میرا دل روتا ہے اور مجھے بے حد دکھ ہوتا ہے۔ دوران جلسہ میں وہ کئی بار رفرط غم سے بے حال ہوگئے اور انھوں نے کانگریس والوں سے نہایت

منت کے ساتھ اپیل کی کہ وہ دولت وثروت، مرتبہ اور عہدے کے لئے اپنے دل کو سیاہ نہ کریں۔ اسپیکر ٹنڈن کو اپنے محب وطن رفیقوں کی بداطواریوں پر روتے دیکھنا ایک ایسا منظر تھا جس سے دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جب سے اسپیکر ٹنڈن یو۔پی کانگریس کے صدر ہوئے ہیں اُن کے پاس برابر کانگریسیوں کی شکایتیں آ رہی ہیں، اور اس کا اُنھیں بے حد صدمہ ہے مسٹر ٹنڈن نے تقریر کے آخر میں کہا کہ "جب کانگریسیوں کے خلاف شرمناک ترین قسم کی شکایتیں میرے منھ پر دے ماری جاتی ہیں تو میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں اور میرا دل بیٹھنے لگتا ہے"۔

(قومی آواز ۷ ستمبر ۱۹۴۸ء)

ان تقریروں کو پڑھ کر اس میں ان مقررین کی حقیقت پسندی اور اخلاقی جرأت کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں زندگی کے کمزور پہلوؤں کو بھی خوب دیکھتی ہیں اور ان کا دردبھرا دل ان پر آنسو بہاتا ہے۔ موجودہ

اخلاقی تنزل ایسا ہی واقعہ ہے کہ ہر محب وطن اُس پر خون کے آنسو روئے اور ملک کا ہر حساس آدمی شرم سے گردن جھکائے۔ ملک کی لڑائی اس امید میں لڑی گئی تھی کہ پردیسیوں کے چنگل سے نکل کر اس ملک کو سچا چین اور سکھ حاصل ہوگا، حقدار کو اُس کا حق ملنے لگا۔ مظلوم کے ساتھ انصاف ہوا کرے گا حکومت کا دار و مدار کسی جماعت یا گروہ کے ذاتی اغراض اور مصلحتوں پر نہیں ہوگا بلکہ بے لاگ حق و انصاف اور اس ملک کے حقیقی فائدوں اور ملک والوں کی ضرورتوں پر ہوگا، ہم نے کہا تھا، اور جہاں تک سیاسی فلسفہ اور نظری علم کا تعلق ہے کچھ غلط نہیں کہا تھا کہ غیر ملکی حکومت پس کی گانٹھ ہے، جب تک یہ نہ نکلے ملک کا مزاج اعتدال پر نہیں آسکتا، اور اس کی زندگی کی چول بیٹھ نہیں سکتی، جب تک خود اُس ملک کے لوگ اس ملک کا انتظام نہ کریں اور اپنے ملک کے فیصلوں کے خود مختار نہ ہوں، اپنے گھر کو اپنی ضرورتوں اور اپنی خواہش کے موافق نہ بنائیں، اس ملک میں خوش حالی عام نہیں ہو سکتی اور سب کو پیٹ بھر روٹی نہیں مل سکتی، ہم پچھلی حکومت میں ہزاروں قسم کی بدعنوانیاں اور نا انصافیاں دیکھتے

تھے اور دل پکڑ کر رہ جاتے تھے کہ غیر پر کیا اختیار ہے یہ قصور ہمارا ہے کہ ہم نے اپنا گھر ان پردیسیوں کے حوالہ کر رکھا ہے جن کو اس ملک اور ملک والوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔
سات سمندر پار کے رہنے والے اس ملک کو تجارت کی منڈی سمجھ کر آئے ان کو جو خطا وار سمجھے اُس کی عقل کا قصور، اس جنم روگ کا علاج یہ ہے کہ اس بدیشی راج کو ختم کیا جائے اور اپنے گھر کا انتظام سنبھالا جائے۔ بات سچی تھی اور دل لگتی، بہت سے ملکوں کا تجربہ بھی یہی تھا، چنانچہ ہم نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے لڑائی چھیڑ دی اور اس مقصد کے لئے وہ سب کچھ کیا جو اس بلند مقصد کے لئے کرنا چاہیئے تھا۔ اور وہ قربانیاں دیں جو ایشیا کے کسی ملک نے پیش نہیں کیں، آخرکار برطانیہ نے ہندوستانی قوم کا سیاسی بلوغ تسلیم کر لیا اور اس کا اقرار کر لیا کہ اب اس کو کسی اتالیق کی ضرورت نہیں وہ اپنے معاملات کو خود چکا سکتا ہے، اس کو مجبور ہو کر اتنے بڑے ملک سے فارغ خطی لکھ دینی پڑی جو اچھا خاصا بر اعظم ہے اور شاہ برطانیہ کے تاج کا کوہ نور ہیرا سمجھا جاتا تھا۔

ہیں یہاں پران افسوسناک واقعات کا ذکر کرکے محب وطن بزرگوں کا ٹھہرا ہوا دل چھیڑنا نہیں چاہتا جو گزشتہ سال ۱۹۴۶ء میں پیش آئے اور جو آزادی کی ایک خیر ضروری قیمت تھی۔ اور جو اس ملک کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے نواکھالی اور بہار اور پھر مغربی اور مشرقی پنجاب اور دہلی پر جو کچھ ہوا وہ مریض کی ایک ہذیانی کیفیت تھی اور ان غیر ذمہ دار آدمیوں کا فعل جو اس ملک کے بنانے والے اور اس کی آزادی کی لڑائی لڑنے والے نہ تھے جو بیچ میں اُس وقت کود پڑے جب آزادیٔ وطن کے معرکے کے مرد میدان اپنا کام ختم کر رہے تھے، لیکن جب یہ گرد بیٹھ گئی اور اس ملک کی ہٹی ہوئی چول اپنی جگہ پر آگئی اور آزادی کا وہ خواب پورا ہوا جسے ہم برسوں سے دیکھ رہے تھے تو ہماری نگاہیں اس کے اصلی نتائج کے لئے اُٹھیں، اور ہم کو ان سب باتوں کا انتظار ہوا جن کا ہم نے خود دوسروں سے وعدہ کیا تھا۔

ہمارا یہ انتظار بے جا نہ تھا، اب ملک کے سیاہ سپید کے مالک وہ لوگ تھے جو حکومت کی کرسی پر جست لگا کر اچانک نہیں پہونچ گئے تھے ان کو بغیر کسی محنت و لیاقت کے اس طرح

اتنی بڑی سلطنت نہیں مل گئی تھی، جس طرح پہلے زمانہ میں کاہل شہزادوں اور نالائق وارثوں کو مل جایا کرتی تھی، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے بیس بیس تیس تیس برس لگاتار آزادی کی لڑائی لڑی تھی، برسوں جیل کاٹی تھی، مہینوں چکی چلائی تھی، جائدادوں اور بڑی بڑی اسامیوں پر لات مار کر محنت و مشقت کی زندگی اختیار کی تھی، بلند مقصد کی خاطر بڑے بڑے فائدوں اور عزتوں کو ٹھکرایا تھا۔ ان سے بڑھ کر اس بھروسہ کے قابل کون تھا کہ وہ اس ملک کے سچے ہمدرد اور بہی خواہ ثابت ہوں گے اور اس ملک کو خوش حال اور اس دیس کے رہنے والوں کو سکھی بنا دیں گے، ان کو اپنے عیش و آرام ذاتی فوائد اور مواقع کو ملک والوں کے فائدے اور عوام کے آرام کی خاطر قربان کرنے میں ذرہ برابر تامل نہ ہوگا، بد دیانتیوں، ناجائز طرفداریوں اور بے اصولیوں سے بہت بلند ثابت ہوں گے دولت و عزت اور اقتدار کی خواہش ان کو سیدھے راستہ سے بال برابر بھی نہ کھسکا سکے گی۔ اس لئے کہ تعلیم، سیاسی تربیت اور قربانیوں میں کوئی جماعت ان سے لگا نہیں کھاتی، اگر ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کے لئے اور قوت و دولت کے

نازک امتحان میں کامیاب بنانے کے لئے یہ تین قابلیتیں شرط ہیں تو اس کی شرط بدی جا سکتی تھی کہ اس جماعت کی اس امتحان میں کامیابی یقینی ہے۔

لیکن ہماری امید اور ظاہری قیاس کے بالکل خلاف ہم کو جو نظر آ رہا ہے اس کے بعد بے اختیار زبان پر آتا ہے کہ ع

کیا کسی کا گلہ کرے کوئی؟

لیکن بڑے ادب کے ساتھ مجھے اپنے ملک کے سیاسی رہنماؤں اور ذمہ داروں سے یہ عرض کرنا ہے کہ خدا نے ان کو سوچنے والا دماغ دیا ہے، وہ صرف جنگ آزادی کے تجربہ کار سپاہی نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے بہت سے سیاست قانون، فلسفہ اور تاریخ کے بھی عالم ہیں۔ ان کی سطح یہ نہیں ہے کہ وہ اس افسوسناک حقیقت پر آنسو بہا کر اور کانگریس کے اور حکومت کے ذمہ داروں کو تنبیہ اور ملامت فرما کر خاموش ہو جائیں، ان کو اس عجیب و غریب گتھی کو سلجھانا چاہئے کہ اعلیٰ تعلیم اور پختہ سیاسی تربیت اور بے داغ قربانیوں کے بعد کیا وجہ ہے کہ ہمارے پختہ کار سپاہی سیاست کی خونریز لڑائی جیتنے کے بعد دولت و قوت کے پُرامن معرکہ

بازی ہار جائیں اور جوکاٹنوں سے اپنا دامن بچانے گئے صاف راستہ میں دامن سلامت نہ رکھ سکیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہماری سیاسی جد وجہد اور قومی تعمیر کی کوشش میں کوئی ایسی چوک رہ گئی جس کی وجہ سے اب ہماری قبائے آزادی میں جگہ جگہ جھول پڑ رہے ہیں اور یہ قیمتی جامہ جگہ جگہ سے مسک رہا ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ ہماری قومی زندگی اور ہماری دماغی رہنمائی اور تربیت نے ضمیر کو بیدار اور ہر وقت خبردار رکھنے والی اور اس کو بے اختیاری اور خود مختاری کی دو متقابل حالتوں میں یکساں پابند قانون اور پابند اخلاق بنانے والی اصل طاقت کو عرصہ دراز سے نظر انداز کر رکھا ہے۔ مذہب کی زبان میں اس کو "ایمان و عقیدہ" کہتے ہیں اس کے دو حصے ہر مذہب میں ملنے گئے ہیں، ایک خدا پر ایمان اور اس بات کا یقین کہ وہ ذرّہ ذرّہ سے واقف، اندھیرے اُجالے کا دیکھنے والا اور جزا و سزا کا مالک ہے، دوسرے مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان اور اس بات کا یقین کہ وہاں اس دنیا کی زندگی کے ذرّہ ذرّہ رتی رتی کا حساب دینا ہوگا

اور عمر بھر کا کیا سامنے آ رہے گا۔

یہی وہ طاقت ہے جس کا قائم مقام دنیا کا کوئی سیاسی یا اخلاقی نظام اور فلسفہ ابھی تک پیدا نہیں کر سکا۔ جہاں یہ خم خالی رہ گیا ہے خالی ہی چلا جا رہا ہے اور اس کی بھرتی کسی قانون اور ضابطہ سے نہیں ہو رہی ہے اس کمی کی وجہ سے زندگی میں رہ رہ کر جھول پڑتے ہیں ایک جھول دور کیجئے تو دوسرے جھول اور پڑ جاتے ہیں۔

ہندوستان میں بھی یہ بہت بڑی طاقت تھی اور تاریخ میں ہم اس طاقت کے بڑے بڑے کرشمے دیکھتے ہیں لیکن کڑوی مگر سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کی یہ طاقت عرصہ دراز سے کمزور ہو چکی ہے۔ روحانی فلسفوں اور بحثوں میں بال کی کھال نکالنے کی جو عادت یہاں رہی ہے اس نے اس کی روح کو کچل کر رکھ دیا۔ کوئی ایسا بڑا روحانی مصلح بھی پیدا نہیں ہوا جو ہزاروں برس کے اس پرانے مذہبی ڈھانچے میں جان ڈال دے۔ رہی سہی طاقت کو مغرب کی مادہ پرستی اور آخر زمانہ کی لا مذہبیت نے ختم کر دیا، غرض اب اس عقیدہ میں اتنی جان نہیں کہ موجودہ زندگی کے اس بھاری بھرکم رتھ کے اس

بڑے پہیہ کو گھما سکے۔ اور اس کی طاقت کے بل پر خواہشات کے منہ زور گھوڑے کا منہ پھیرا جا سکے۔

اس عرصہ میں آزادی کی جنگ شروع ہوئی وہ خالص مغربی سیاست کے اصولوں اور بنیادوں پر لڑی گئی۔ سارا جھگڑا صرف پیٹ اور جیب و زر اور زمین کا تھا اور شروع سے آخر تک صرف "مادی اقدار" (NATERIAL VALUES) کا تھا۔ اس میں نہ کہیں اوصاف کی بحث تھی، نہ اخلاق کی، نہ ایمان و عقیدہ کی کوئی شرط تھی، نہ خدا ترسی کا کوئی امتحان۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب اس گروہ کو جس کی ساری تربیت اس ماحول میں ہوئی تھی ملک کی کنجیاں مل گئیں اور اس نے حکومت و قوت کے اس راستہ پر قدم رکھا جو کانٹوں سے بھرا اور گہری خندقوں سے گھرا ہوا تھا تو ان کو امانت و دیانت اور اصول و اخلاق کی نازک پٹری پر ثابت قدم رکھنے کے لئے صرف کچھ قانونی اصطلاحات و ضوابط تھے جن سے نکلنا ان کے لئے بہت آسان تھا۔ اب اگر وہ گروہ جس کی ساری ذہنی تربیت پیٹ اور جیب کے ماحول میں ہوئی اور جس کے سامنے زندگی کی کوئی اور دوسری جیتی جاگتی حقیقت نہ ہو۔ اسی پیٹ اور جیب کی

خاطر نفع خوری، خیانت، رشوت ستانی اور چور بازاری کے جرائم کا ارتکاب کرے تو تعجب کی کیا بات ہے؟

پھر آج ہماری سوسائٹی، ہمارے ادب اور ہماری زندگی کے تمام میدانوں میں دولت کی جو حد سے بڑھی ہوئی اہمیت اور دولتمند اور عہدہ دار کی بندگی کی حد تک پہونچی ہوئی عزت ہے اور اس ملک میں دولت کو جو مذہبی تقدس حاصل رہ چکا ہے اور اب زندگی کا معیار جس طرح روز بروز اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ گرانی صبح و شام بڑھ رہی ہے اور غیر ضروری سامان اور "تعیشات" (LUXRUIAS) کی بازاروں میں بھرمار ہے اس سب کے ہوتے ہوئے اگر وہ لوگ جو اخلاقی احساس اور مذہبی تربیت سے محروم ہیں، سوسائٹی کے معیار پر پورا اترنے کے لئے اور گھر کی نہ ختم ہونے والی فرمائشوں کو پورا کرنے کے لئے کبھی کبھی بددیانتوں اور بے اصولیوں سے مدد لے لیا کریں تو حیرت کی کیا بات ہے۔

آج ہمارا ریڈیو، ہمارا پریس، اخبارات و رسالے، ناول اور قصے، ادب اور فلسفہ، سنیما اور تصویریں، ہماری گھریلو زندگی اور خاندانی تقریبیں، دوستوں کی محفلیں اور تفریحی کلب سب مل کر دولتمند اور معزز بننے کے جذبہ اور شوق کو بڑھا رہے ہیں اور اس کی

آگ کو بھڑکا رہے ہیں۔ اور اس جذبہ کے خلاف ملک بھر میں ایک بھی اخلاقی تحریک اور طاقتور آواز نہیں۔ اس بنا پر اگر کوئی تاجر یا ملازم جلد یا زیادہ دولتمند بننے کیلئے خشک اخلاقی اور بے جان "قاعدے قانون" کی پرانی ڈگر کو چھوڑ دیتا ہے اور اخلاقی پستی میں اُتر جاتا ہے اس پر ہم کو چاہے کتنا دکھ ہو تعجب کرنے کا حق نہیں۔

شاید اس کے جواب میں کہا جائے کہ آج سارا یورپ اور امریکہ عملاً لا مذہب اور خدا اور آخرت کے عقیدہ سے بالکل خالی ہے پھر اس کا اخلاقی اور اصولی معیار کیوں قائم ہے اور کیوں اس کے نظام حکومت میں وہ بے اصولیاں اور بد اخلاقیاں نہیں ملتیں جو ہمارے ملک میں اتنے تھوڑے دنوں کے اندر نظر آنے لگی ہیں ؟

میں عرض کروں گا کہ یورپ اور امریکہ کے متعلق یہ خیال صحیح نہیں اس کا اخلاقی معیار اس کی تعلیم و تہذیب کے مطابق نہیں، جو اپنے ملک اپنے جیسے انسانوں کی گنجان شہری آبادیوں (ہیروشیما اور ناگاساکی) پر ایٹم بم گرا کر لاکھوں انسانوں معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں کو ہلاک اور جیتے جاگتے شہروں کو خاک کا ڈھیر بنا سکتا ہے اور جس ملک کا سب سے بڑا انسان جس کو اس ملک کا سب سے بڑا اعتماد حاصل ہے محض انتخاب جیتنے اور زیادہ ووٹ حاصل کرنے کے لیے

کروڑوں عربوں کے جائز و فطری مطالبہ کے خلاف پوری بےحیائی سے یہودیوں کو تقسیم فلسطین کی منظوری اور پھر یہودی ریاست کو تسلیم کرنے کی رشوت دے سکتا ہے۔ اور جب یورپ کا ایک ذمہ دار ترین انسان (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) اپنے ملک میں عزت اور تاریخ میں جگہ حاصل کرنے کے لئے فسادات کی روک تھام سے عمداً پہلوتہی کر کے لاکھوں بے گناہ انسانوں کی ہلاکت و مصیبت کا سبب بن سکتا ہے اس ملک کو مہذب و با اصول کہنا۔ اصول تہذیب پر دھبہ لگانا ہے۔

البتہ اتنی بات صحیح ہے کہ تعلیم۔ صدیوں کی حکومت کی عادت اور شہریت کے احساس نے اس کے معیار اخلاق کو نیچی اور اوچھی باتوں سے بلند کر دیا ہے، اس کی اخلاقی بدعنوانیاں اور بے اصولیاں ذرا مہذب اور خوش نما (REFIRED) ہیں، بدقسمتی سے طویل غلامی اور جنگ آزادی کی مصروفیت نے ہمارے قومی رہنماؤں کو اس کا بھی موقع نہیں دیا کہ عوام کی ذہنی سطح بلند ہو ان میں شہری زندگی کا احساس اور انسانیت کا احترام پیدا ہو اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ سلوک کرنے میں ذرا فراخ حوصلگی اور فیاضی سے کام لیں۔

اس موقع پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اچھا اگر خدا کا یقین اور دوسری زندگی کا عقیدہ اخلاقی احساس اور پختگی پیدا کر سکتا ہے

اور اپنے ماننے والوں کو بے اصولیوں، ناجائز طرفداریوں نفع خوری رشوت ستانی اور دولت کی بڑھی ہوئی ہوس سے روک سکتا ہے تو اسلامی ملکوں میں یہ خرابیاں کیوں پائی جاتی ہیں ان ممالک کو تو جنت نظیر ہونا چاہیئے تھا، جہاں نہ بداخلاقی ہو نہ بے اصولی نہ زیادتی نہ بدزبانی۔

میں صفائی سے عرض کروں گا کہ ان ملکوں میں کوئی بھی اس تعلیم اور عقیدہ کا مکمل نمونہ نہیں ہے اور کوئی بھی سند کی حیثیت نہیں رکھتا، اور اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ وہاں کی ساری خرابیاں اسی عقیدہ کی کمزوری اور اسی تربیت کی کمی اور ان لوگوں کے اقتدار کا نتیجہ ہیں جن کی اخلاقی تربیت اور ایمانی سیرت کچی رہ گئی ہے اور دولت کی محبت اور زندگی کی ہوس کا روگ ان کو بھی لگ گیا ہے۔ اگر ایسے ملکوں میں جن کو اکثر بے سوچے اسلامی ملک کہہ دیا جاتا ہے اس قسم کی خرابیاں پائی جاتی ہیں تو وہ اسی عقیدہ کی کمزوری کا نتیجہ ہیں

اس خرابی کا علاج دونوں جگہ یکساں ہے اگرچہ علاج کے موثر ہونے کے بارے میں ضرور اس فاصلہ کا فرق ہوگا جو اصل مذہبی تعلیم سے اس ملک میں پیدا ہو چکا ہے جہاں یہ مذہبی تعلیم محفوظ ہے وہاں یاد دہانی اور تنبیہ کافی ہوگی اور جہاں اصل مذہب اور پیغمبر کی تعلیم بہت کچھ مٹ چکی ہے وہاں زیادہ کوشش اور روحانی طاقت کی ضرورت ہوگی۔

آج تو ہمیں سلین تاریخ کے جس دور تیں ان عیاد اور ان ریت زندگی میں اپنی جگہ پیدا کر لی تھی اور اس کی جڑوں نے زمین پکڑ لی تھی، وہاں ان بے اصولیوں، بے عنوانیوں اور زیادتیوں کا نام و نشان نہیں ملتا۔ جن لوگوں کی تاریخ پر نظر ہے اُن کو معلوم ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جو خلیفۂ اول تھے زمانۂ خلافت میں اپنی بیوی کی جمع کی ہوئی رقم کو جو اُنھوں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر اس لئے بچائی تھی کہ اس سے کبھی میٹھی زندگی میں ایک دن منھ میٹھا کر لیں گے یہ کہہ کر عام مسلمانوں کے خزانہ میں داخل کر دیا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہماری ضرورتوں سے فاضل ہے آئندہ سے اتنے پیسے کم کر کے ہم کو روزینہ دیا جائے۔ حضرت عمرؓ کی سادہ زندگی تاریخ میں مثال کی حیثیت رکھتی ہے انھوں نے اپنے بیٹے (عبداللہ بن عمرؓ) کو جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابی اور بڑے عالم اور دیانتدار تھے خلیفہ منتخب ہونے اور خلیفہ کا انتخاب کرنے کا حق نہیں دیا اور فرمایا کہ ہمارے خاندان میں سے ایک ہی آدمی اس بوجھ اور ذمہ داری کیلئے کافی تھا۔ حضرت علیؓ کی اپنی خلافت کے زمانہ میں فقیرانہ زندگی اور احتیاط کا یہ حال تھا کہ ان کے حقیقی بھائی عقیلؓ ان کے ساتھ نہ رہ سکے اور انھوں نے اپنے چچازاد بھائی عبداللہ بن عباس سے بھی خبر لی کی

طرح پائی پائی کا حساب لیا۔

شاید کہا جائے کہ یہ دنیا کی ترقی اور تمدن سے پہلے کی باتیں ہیں، جب زندگی نہایت سادہ، ضروریات کم اور خرچ مختصر تھے مگر ایک باخبر انسان سے یہ بات چھپی نہیں ہے کہ یہ عرب رومی اور ایرانی سلطنت اور ان کے ان خزانوں اور دولتوں کے مالک ہوئے تھے جو انھوں نے سیکڑوں برس میں جمع کی تھیں وہ اگر چاہتے تو ایک وقت میں رومی و ایرانی خزانوں کی مدد سے ان کی راجدھانی میں بیٹھ کر وہ عیش کرتے اور اس طرح کھیل کھیلتے جو رومی و ایرانی بادشاہ بھی نہیں کر سکتے تھے، اس لئے کہ دونوں بڑی مغربی و مشرقی شاہنشاہیاں ایک وقت میں ان کے ہاتھ لگی تھیں مگر ان کی پچھلی سادہ زندگی، ان کی فقیرانہ رہائش اور ان کی جفاکشی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

پھر اس کا بھی لحاظ رہے کہ آج جن کو عہدے اور ملک کی باگ ڈور ملی ہے وہ ملک کی آزادی سے پہلے بھی کھاتے پیتے لوگ تھے وہ روپیہ پیسہ کے بھوکے اور مال و دولت کے ترسے ہوئے نہیں تھے، لیکن وہ لوگ جو کسریٰ اور قیصر کی سلطنت کے مالک ہوئے تھے انھوں نے ساری عمر غریبی میں بسر کی تھی، انھوں نے کبھی خواب میں بھی وہ سامان نہیں دیکھا تھا جو ان کو ایران اور شام کے شہروں میں

باتھ لگا۔ وہ فاقہ کرتے کرتے کپڑوں پر چیتھڑوں کے پیوند لگاتے لگاتے اور ببول کے کانٹوں سے ان کو اٹھاتے اٹھاتے ایک دم سے بے اندازہ دولت کے مالک اور زمین کے سب سے بڑے زرخیز و متمدن علاقوں کے بادشاہ بن گئے تھے مگر اس سے نہ ان کے مزاج میں کوئی فرق آیا نہ طرز رہائش میں، جب تک یہ اخلاقی تربیت اور ایمانی سیرت باقی رہی وہ بداخلاقیاں اور بے عنوانیاں ظاہر نہیں ہونے پائیں جو ایک ایسی ریاست کا خاصہ ہیں جو عملاً غیر مذہبی (SECULAR STATE) ہو خواہ قانونی یا اصطلاحی طور پر مذہبی کہلاتی ہو جیسا کہ مسلمانوں کی اخلاقی گراوٹ کے زمانہ میں نظر آتا ہے۔

جو لوگ اس ملک کی ضرورتوں پر گہری نظر رکھتے ہیں اور وقتی جذبات ان پر غالب نہیں ہیں وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اس وقت ملک کی سب سے بڑی ضرورت اس اخلاقی احساس کی بیداری اور احساس ذمہ داری ہے جو با اختیار طبقہ کو ان سب بے عنوانیوں، زیادتیوں، ناانصافیوں، تنگ نظری، اعزہ پروری، ناجائز طرفداری کی نیچی سطح سے بلند کرے۔ تجار و ملازمین کو حد سے بڑھی ہوئی نفع خوری، رشوت ستانی اور چور بازاری سے محفوظ کرنے اور اس طرح ملک کو اس عام ابتری، بے نظمی، بے روزگاری

ہوشربا گرانی اور قحط سالی سے بچائے جس کا قریبی خطرہ سر پر کھیل رہا ہے اور جس کی موجودگی میں آزادی کی جنت مصیبتوں اور پریشانیوں کی جہنم بن جاتی ہے، شاید کسی کو اس حقیقت سے انکار نہ ہوگا کہ ہماری تمام علمی، ادبی، تہذیبی (CULTURAL) اور لسانی (LINGUISTIC) ضرورتوں پر یہ اخلاقی ضرورت مقدم ہے، فرض کر لیجیے اس ملک کا ایک ہی کلچر، ایک ہی تہذیب اور ایک ہی زبان ہو گئی لیکن ان بداخلاقیوں کا خاتمہ نہ ہوا جن کی وجہ سے زندگی مشکل ہو رہی ہے تو کیا اس سے ملک کی اصلی ضرورت پوری ہو گئی اور کیا ان بداخلاقیوں اور بدعنوانیوں پر پردہ پڑ جائے گا۔ اگر دنیا کے جرائم پیشہ اور بداخلاق انسان جن کی اخلاقی سطح پست اور جن کی زندگی گھٹیا ہو ایک ہی کلچر اور ایک ہی زبان اختیار کر لیں تو کیا دنیا کی کوئی تہذیب اور کوئی عدالت ان کا گناہ معاف کر دے گی، کیا اگر تمام دنیا کے ڈاکو ایک ہی وردی پہن لیں اور ایک ہی بولی بولنے لگیں تو یہ کوئی خوشی اور اطمینان کی بات ہوگی اس لئے ایک ہوشمند انسان سے اس کی توقع کرنی چاہیئے کہ وہ اصل زہریلی بیماریوں کی طرف توجہ کرے گا جو ہمارے ملک کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں اور اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی ہیں۔

ان بیماریوں کا علاج ایک صحیح توانا خود زندہ اور دوسروں میں زندگی پیدا کر سکنے والے مذہب کے سوا نہیں ہے جو اپنے ماننے والوں میں خدا کا سچا یقین اور اس سے زندگی میں زندہ تعلق مرنے کے بعد کی زندگی کا عقیدہ اور وہاں کی پوچھ گچھ کا کھٹکا پیدا کرے، جو اس زمانہ کی مادیت اور دنیا کی بڑھی ہوئی ہوس کو اپنی روحانی طاقت سے دبا دے، جو انسانوں کی خواہشات ان کے قیاسات اور ان کے صبح و شام کے بدلنے والے معلومات اور تجربوں سے اتنا اونچا ہو کہ ہر زمانہ کی ضرورتوں اور زندگی کے نئے نئے مسائل کو حل کر سکے اور جس کو خود کبھی بدلنے کی ضرورت نہ ہو، جو انسانوں کے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروندوں اور بچوں کی طرح کھینچی ہوئی ملک و وطن کی چھوٹی چھوٹی لکیروں سے بے نیاز ہو کر ساری انسانیت سے تعلق رکھتا ہو اور آدم کے پورے کنبہ کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہو، جس کی بنیاد کسی زمانہ کی رسموں، رواجوں اور عادتوں پر نہ ہو جس کی وجہ سے بڑھتی ہوئی انسانیت اور دوڑتی ہوئی زندگی کو پیچھے کی طرف لوٹنا اور اپنی صدیوں کی محنتوں پر پانی پھیرنا پڑے۔ بلکہ کچھ اٹل اصولوں اور پائیدار حقیقتوں پر ہو جن کے اندر ذہن و دماغ کو اپنی ذہانت

دکھائے اور زندگی کی رگوں میں تازہ خون پہونچانے کی گنجائش ہو جس کے پاس دونوں زندگیوں، دنیا و آخرت، دونوں حالتوں فقر و امارت دونوں طبقوں مرد و عورت کے لئے زندگی کے مکمل قوانین اور آداب ہوں۔ جس کے پاس ایک ایسے کامل انسان کی زندگی کی ایسی کامل اور محفوظ تاریخ ہو جس سے انسانوں کے ہر طبقہ کے ہر فرد، اور ہر فرد کی ہر منزل زندگی کے لئے روشنی اور ہدایت ملتی ہو۔

اس ملک کے رہنماؤں اور حکومت کے ذمہ داروں کو خدا نے ایک بہت بڑی قوم کی امانت سپرد کی ہے اور دل و دماغ کی بہت سی صلاحیتیں بخشی ہیں۔ اگر میری کمزور آواز ان تک پہونچ سکے تو میں ادب سے عرض کروں گا کہ دیکھئے کہیں یہ قوتیں چھوٹی چھوٹی باتوں اور چھوٹے چھوٹے کاموں میں صرف ہو کر نہ رہ جائیں، ایک مرتبہ جرأت اور ہمت سے کام لے کر قوم کو انسانی زندگی کی اصل منزل کا راستہ دکھا دیجئے، اس کو وطنیت و قومیت کے قید خانہ اور جسم و مادہ کے اس تنگ آشیانہ سے نکال کر خدا پرستی، انسان دوستی اور اعلیٰ روحانیت کی اس وسیع دنیا میں پہونچا دیجئے جس کی جغرافیہ میں مشرق و مغرب کی تفریق اور جس کے زمانوں میں ماضی

دھال کی تقسیم نہیں، جہاں خدائے واحد اس کا معبود، ساری انسانی برادری اس کا کنبہ، ہر سچی اور میٹھی زبان اس کے دل کی ترجمان۔ ہر صحیح علم و ادب اس کا ذخیرہ، حکمت کی ہر بات اس کا گم شدہ مال ہو، اگر آپ نے ایسا کیا تو ہندوستان نہ صرف اپنی آزادی اور عزت ہی برقرار رکھ سکے گا، بلکہ قوموں کی سرداری اس کے ہاتھ میں آجائے گی اور اس کا یہ نیا دور اس کی پرانی تاریخ کے ہر اس دور سے زیادہ باعظمت اور شاندار ہوگا جس کا زندہ کرنا آپ کی زندگی کا خاص مقصد معلوم ہوتا ہے۔



باہتمام سید توسل حسین
یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ میں چھپی

آپکے مطالعے اور دوستوں میں اشاعت کیلئے

بصیرت افروز اور ہمت افزا مضامین

از سید ابوالحسن علی ندوی



۱— انسان راہ	....	چار آنہ
۲— یہ اخلاقی گراوٹ کیوں ؟	....	دس پیسہ
۳— ہندوستانی سماج کی جلد خبر لیجئے		دس پیسہ
۴— آنکھوں کی سوئیاں	....	دو آنہ
۵— روشنی کا مینار	....	دو آنہ
۶— مرد خدا کا یقین	....	تین آنہ
۷— ایک اہم دینی دعوت	....	چھ آنہ
۸— مسلمانوں کی اصلی طاقت	....	چھ آنہ
۹— دنیا کے نقشہ میں مسلمانوں کی جگہ	....	



ملنے کا پتہ

مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ